Aim-1977-2557(3)

(8)

16 Pages

خطبۂ صدارت

جو

ترجمان حقیقت ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب ایم-اے-پی ایچ-ڈی

بیرسٹرایٹ لاء نے

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
LIBRARY.
Acc. No... 25940
LAHORE.

آل انڈیا مسلم کانفرنس

کے اجلاس لاہور

منعقدہ ۲۱-۲۲- مارچ سنہ ۱۹۳۲ء

میں

ارشاد فرمایا

باہتمام مولا داد صاحب

مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرات! ہندوستان کے مسلمان اپنے سیاسی پلیٹ فارموں سے اتنے خطبے سن چکے ہیں۔ کہ ان میں سے بے تاب عناصر نے ہمارے مشوروں اور فیصلوں کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے۔ کہ یہ مشورے اور فیصلے اس روح عمل کو کمزور کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔ جو قلب اسلام میں پوشیدہ ہے اور انجام کار اس روح کو کلیۃً فنا کر ڈالتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ کہ ملک میں اس وقت جو صورت حالات پیدا ہے۔ اس سے عمل وحرکت کی اشتہا تیز ہوتی ہے۔ اور اگر ہمارے رہنما مسلمانانِ ہند کی خاص پوزیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی قطعی راہ عمل نہ بتا سکے۔ تو تعالی کی وارفتگی اپنا کام کر جائے گی۔ اور ہمارے نوجوان مآل و انجام پر غور کئے بغیر واقعات وحوادث کے سیل میں کود پڑیں گے۔" ایک اور نوجوان نے جس کے انداز گفتگو سے شباب کی ناشکیبائی ٹپک رہی تھی۔ کہا "عمل پہلے سے سوچی سمجھی ہوئی سکیم کا محتاج نہیں۔ یہ اس منطق کا پابند نہیں جس کی تعلیم سکولوں میں دی جاتی ہے بلکہ جب یہ انسانی قلب کے نہانخانہ سے نکل کر کھلے میدان میں آتا ہے۔ تو اپنی منطق خود پیدا کر لیتا ہے۔" یہ ہمارے نوجوانوں کے موجودہ جذبات واحساسات کا ایک مرقع ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔ کہ اس نازک مرحلے پر آپ نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے منصب صدارت پر سرفراز کیا لیکن میں آپ کو اس انتخاب پر مبارکباد نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ آپ نے ایک ایسے شخص کو اپنا صدر بنایا ہے۔ جو زیادہ تر تخیل کی دنیا میں رہنے والا ہے۔ شاید آپ کا خیال یہ ہو۔ کہ آپ کو اس نازک موقع پر ایک تخیل پرست ہی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جہاں تخیل کار فرما نہیں ہوتا۔ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ یا شاید آپ یہ سمجھتے ہوں۔ کہ لندن کانفرنس کے تجربات کی وجہ سے میں اس اجتماع کی صدارت کا زیادہ اہل ہوں تخیل کو مادی تقیدات سے آزاد رکھ کر ظاہر کرنا ایک الگ کام ہے۔ اور تخیلات کو زندہ حقیقتوں کی دنیا میں منتقل کرنے کا راستہ دکھانا بالکل جداگانہ کام ہے۔ جو شخص فطرتاً اور طبعاً اول الذکر وظیفہ کی بجا آوری کا اہل ہے۔ اس کا کام نسبتاً سہل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ان مادی تقیدات کو بیک جست عبور کر جاتا ہے۔ جو قدم قدم پر عملی سیاست والوں کے مزاحم ہوتے ہیں۔ جو انسان اول الذکر وظیفہ سے گذر کر آخر الذکر وظیفہ پر آتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ مسلسل ومتواتر ان تقیدات کا جائزہ لیتا رہے۔ جنہیں خالص تخیل پرستی کے میدان میں وہ نظر انداز کئے بیٹھا تھا۔ اور اکثر اوقات اسے ان تقیدات کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ ایسا انسان ایک دائمی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ اور اس پر بہ آسانی تضاد وتخالف کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ تاہم میں خوشی سے اس نازک اور مشکل منصب کو قبول کرتا ہوں۔ جو آپ نے مجھے عطا کیا ہے۔ اس لئے نہیں۔ کہ میں اپنے آپ کو اس منصب کا اہل سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ خوش قسمتی سے تمام مسائل صاف اور مجلے ہو چکے ہیں۔ اور اب اصل کام کسی ایک انسان کی رہنمائی کا محتاج نہیں۔ بلکہ تمام افراد کے عزائم اور ارادوں کے ایک مقصد کے لئے مرتکز ہو جانے پر موقوف ہے۔

سیاسیات کی جڑ حقیقتہً انسان کی روحانی زندگی میں ہے میرا عقیدہ ہے۔ کہ اسلام ذاتی آرا کا نام نہیں۔ بلکہ یہ سوسائٹی ہے۔ یا اگر آپ پسند فرمائیں۔ تو میں کہوں گا۔ کہ یہ ملکی مذہبی نظام ہے۔ میں اسی لئے سیاسیات میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ کہ کہیں حاضرکے سیاسی معقدات اسلام کے ابتدائی اصول اور حیثیت کو متاثر نہ کریں۔ میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم کا مخالف

نہیں۔ کہ اگر یہ نیشنلزم ہندوستان میں نشوونما پا جائیگا۔ تو مسلمان اس سے کم فائدہ اٹھائیں گے۔ بلکہ اس لئے مخالف ہوں۔ کہ مجھے اس میں دہریانہ مادیت کے جراثیم نظر آرہے ہیں۔ جو میرے نزدیک دورِ حاضر کی انسانیت کے لئے شدید ترین خطرات کا سرچشمہ ہیں۔ حب وطن ایک فطری خوبی ہے۔ اور یہ انسان کی اخلاقی زندگی کا جزو ہے۔ لیکن جو شے ضروری ہے۔ وہ انسان کا عقیدہ ہے اس کا کلچر ہے۔ اور اس کی تاریخی روایات ہیں۔ یہی چیزیں ہیں۔ جن کے لئے انسانوں کو زندہ رہنا چاہیئے۔ اور جن کی خاطر انہیں اپنی جانیں قربان کرنی چاہئیں۔ زمین کا وہ ٹکڑا جس کے ساتھ انسان کی روح عارضی طور پر وابستہ ہوتی ہے۔ اس قابل نہیں کہ اسے بہت اہمیت دی جائے۔ ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان ظاہر اور مخفی ربط وضبط کے جو نقاط ہیں۔ انہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے۔ کہ ہم ایک ایسا یک آہنگ "اجتماعی وجود" تعمیر کر سکتے ہیں جس کی وحدت اس کثرت سے متاثر ہو جو اس کے دامن سے لازماً وابستہ رہے گی۔ ہندوستان قدیم کے سامنے یہ عقدہ پیش تھا۔ کہ وحدت اپنی "یکی" کو قربان کئے بغیر کثرت کیوں کر بن گئی؟ آج یہ عقدہ اپنی سماوی بلندیوں سے اتر کر ہماری سیاسی زندگی کی عام سطح پر آگیا ہے۔ اور ہمیں اسے بالکل برعکس شکل میں طے کرنا ہے۔ یعنی یہ کہ کثرت اپنے تعدد کو قربان کئے بغیر کیوں کر وحدت کی شکل اختیار کر سکتی ہے جس حد تک ہماری پالیسی کے اصول ومبانی کا تعلق ہے میں کوئی نئی چیز آپکے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔ جو کچھ ضروری تھا۔ اسے آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبے میں عرض کر چکا ہوں۔ موجودہ خطبے میں بعض دوسری چیزوں کے علاوہ میں سب سے پہلے آپ کو اس صورت حالات کا صحیح اندازہ کرنے میں امداد دوں گا۔ جو گول میز کانفرنس میں ہمارے ڈیلیگیشن کے ایک حد تک متذبذب رویہ سے پیدا ہوئی پھر میں اپنی بصیرت کے مطابق میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا۔ کہ گزشتہ لندن کانفرنس میں وزیر اعظم کے اعلان نے ساری صورت حالات کے غور مطالعہ کی ضرورت پیدا کر دی ہے۔ تو اس سلسلے میں نئی پالیسی کی وضع وترتیب کس حد تک مناسب ہے۔ میں مسلم ڈیلیگیشن کے کام کی مختصر سی سرگزشت سے سلسلہ کلام شروع کرتا ہوں۔

سیاسی صورت حالات

اقلیتوں کی کمیٹی کے پہلے دو اجلاس علی الترتیب ۲۸ ستمبر اور یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ہوئے۔ دونوں موقعوں پر اجلاس فرقہ وار مسئلہ کے متعلق باہمی سمجھوتے کی کوشش کے لئے ملتوی ہوتے رہے۔ مہاتما گاندھی نے پہلے مسلم مندوبین سے کہا۔ کہ جب تک مسلمان (گول میز کانفرنس کے لئے) ڈاکٹر انصاری کی نامزدگی کے خلاف اعتراض واپس نہیں لیں گے (اور ڈاکٹر صاحب کو لندن بلایا نہیں جائیگا) اس وقت تک کچھ نہیں ہو سکیگا۔ یہ مطالبہ مسلمانوں نے منظور نہ کیا۔ تو مہاتما جی نے مسلم مندوبین سے کہا۔ کہ وہ (مہاتما گاندھی) خود مسلمانوں کے مطالبات منظور کر لیں گے۔ نیز کانگرس سکھوں اور ہندوؤں کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ بشرطیکہ مسلمان ان تین چیزوں کو تسلیم کر لیں:۔

(۱) بالغوں کے لئے حق رائے

(۲) اچھوتوں کے لئے خاص نیابت کی مخالفت

۳۔ کامل آزادی کے لئے کانگرس کے مطالبہ کی تائید

مہاتما جی نے اس معاملہ کے متعلق کانگرس سے استصواب کرنے سے انکار کر دیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کو اس سمجھوتے پر رضامند کرنے کی کوششوں میں وہ ناکام رہے۔ ۷ر اکتوبر کو دو مشہور ہندو رہنماؤں نے تجویز پیش کی۔ کہ سارا معاملہ سات ثالثوں کے ایک بورڈ کے حوالے کر دیا جائے۔ ہندو اور سکھ نمائندوں نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا۔ ۸ر اکتوبر کو اقلیتوں کی کمیٹی کا تیسرا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مہاتما گاندھی نے فرقہ دار معاملات کے متعلق سمجھوتہ نہ ہو سکنے کا الزام حکومت برطانیہ پر عائد کر دیا۔ اور کہا۔ کہ حکومت نے برطانوی ہند کے ڈیلی گیشن میں دیدہ و دانستہ ایسے آدمی نامزد کئے۔ جو نمائندہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ سر محمد شفیع مرحوم نے مسلمانوں کی طرف سے مہاتما جی کے نامناسب اعتراضات کا جواب دیا۔ اور ان کی پیش کردہ تجویز کی مخالفت کی۔ اقلیتوں کی کمیٹی کا یہ تیسرا اجلاس بھی یونہی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد برطانوی پارلیمنٹ کے انتخابات کی وجہ سے ۱۲ر نومبر تک کوئی جلسہ نہ ہو سکا۔ ۱۵ر اکتوبر کو پرائیویٹ گفتگوئیں پھر شروع ہو گئیں۔ پنجاب کے متعلق سر جافرے کاربٹ کی سکیم ان گفتگوؤں کا نمایاں موضوع تھی۔ یہ سکیم اس تجویز سے بہت مشابہ تھی جسے میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ صدارت میں پیش کیا تھا۔ سر جافرے کاربٹ کا مدعا یہ تھا۔ کہ انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے علیحدہ کر کے اس صوبے میں مخلوط انتخاب رائج کر دیا جائے۔ ہندو اور سکھ نمائندوں نے اس سکیم کو بھی مسترد کر دیا۔ اس لئے کہ وہ پنجاب میں مخلوط انتخاب کے ساتھ بھی مسلمانوں کی اکثریت کے روادار نہ تھے۔ جب یہ گفتگوئیں بھی بے نتیجہ رہیں۔ تو ان اقلیتوں کے نمائندوں نے جو ہندوستان کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ تھیں۔ اقلیتوں کا میثاق بنانے کے لئے باہم غور و مشورہ شروع کر دیا۔ ۱۲ر نومبر کو سکھوں کے سوا تمام اقلیتوں نے اس میثاق پر دستخط ثبت کر دیئے۔ اور ۱۳ر نومبر کو اقلیتوں کی کمیٹی کے آخری اجلاس میں اس میثاق کو باقاعدہ وزیر اعظم کے حوالے کر دیا گیا۔

ہماری غیر رسمی گفتگوؤں کا یہ مختصر سا مرقع کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ ہمارے مندوبین نے فرقہ وار سمجھوتے کے لئے مخلصانہ کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن جو چیز میرے لئے راز ہے۔ اور جو شاید ہمیشہ راز رہے گی۔ وہ ہمارے رہنماؤں کا اعلان ہے۔ جو ۲۶ر نومبر کو فیڈرل سٹرکچر کمیٹی کے اجلاس میں کیا گیا۔ اور جس کے ذریعہ سے مرکزی ذمہ داری اور صوبجاتی خودمختاری کے بیک وقت نافذ ہونے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ اعلان صلح جوئی اور ملک کی سیاسی ترقی کے لئے اضطراب کا نتیجہ تھا۔ یا ان متصادم و متضاد اثرات کا نتیجہ تھا۔ جو مسلمانوں کے دلوں پر کار فرما تھے۔ ۱۵ر نومبر کو یعنی جس روز میں نے ڈیلی گیشن سے بے تعلقی اختیار کی۔ مسلمان مندوبین فیصلہ کر چکے تھے۔ کہ فیڈرل سٹرکچر کمیٹی کے مباحث میں حصہ نہیں لیں گے۔ پھر انہوں نے اپنے فیصلے کے خلاف مباحث میں کیوں حصہ لیا؟ کیا فیڈرل سٹرکچر کمیٹی کے مسلم مندوبین کے ترجمانوں کو ۲۶ر نومبر والا اعلان کرنے کا مجاز بنایا گیا تھا؟ میں ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ مسلمان اس اعلان کو ایک شدید غلطی سمجھتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ یہ کانفرنس اس اہم معاملے کے متعلق اپنی رائے کا موثر اظہار کرے گی۔

اپنے آل انڈیا مسلم لیگ والے خطبے میں میں نے آل انڈیا فیڈریشن کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا۔ کہ آل انڈیا فیڈریشن کی تجویز ہندوستان کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے۔ کہ اس فیڈریشن کو عمل میں لانا طویل وقت کا محتاج ہے۔ پھر اگر مرکزی ذمہ داری کا نفاذ آل انڈیا فیڈریشن کی تکمیل پر موقوف ہے۔ تو حکومت کو چاہیئے کہ برطانوی ہند کے صوبجات میں فوراً ذمہ دار حکومتیں رائج کر دے۔ تاکہ یہ بنیادی پتھر مرکزی ذمہ داری کے آنے تک اس قابل ہو جائیں۔ کہ فیڈریشن کی عمارت کا بوجھ سنبھال سکیں۔ موجودہ دور کی حقیقی فیڈرل حکومت کے نظام کو پایۂ تکمیل پر پہنچانے کے لئے ابتدائی محنت کی کافی ضرورت ہے۔ میرے پاس یہ یقین کرنے کے وجوہ موجود ہیں۔ کہ بعض انگریز مدبروں نے ہمارے رہنماؤں کو یہ غلط مشورہ دیا تھا۔ کہ وہ برطانوی ہند کے صوبوں میں ذمہ دار حکومتوں کے فوری نفاذ کی مخالفت کریں۔ اور مسلم ڈیلیگیشن سے علیحدگی اختیار کرنے سے چند روز پیشتر ہی میرے دل میں اس قسم کے شبہات پیدا ہو چکے تھے۔ حال میں لفٹننٹ کمانڈر کنوردی نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں:-

مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ بعض انگریز سیاست والوں نے لندن میں اعتدال پسند رہنماؤں کو یہ خراب مشورہ دیا تھا۔ کہ وہ صوبجاتی خود مختاری کی ایک بڑی قسط کو مسترد کر دیں۔ افسوس کہ یہ مشورہ بلا تامل قبول کر لیا گیا۔ اور دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ مہاتما گاندھی کی روش سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ خود اختیاری حکومت کی اس قسط پر ہمدردی سے غور کرنے کے لئے تیار تھے۔

سر تیج بہادر سپرو نے لندن میں نیز مرکزی مشاورتی کمیٹی میں صوبجاتی خود اختیاری حکومت کے فوری نفاذ کے متعلق جو روش اختیار کی اسے مدنظر رکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اعتدال پسند رہنماؤں سے کمانڈر کنوردی کا اشارہ ہندو لبرلوں کی طرف نہ تھا بلکہ مسلمان اعتدال پسندوں کی طرف تھا۔ جن کا ۲۶ر نومبر والا اعلان میری رائے میں وزیر اعظم کے اس اعلان کا موجب ہوا۔ کہ مرکزی ذمہ داری اور صوبجاتی ذمہ داری کے نظام بیک وقت نافذ ہوں گے۔ اور چونکہ صوبوں میں ذمہ داری کے فوری نفاذ کے ساتھ پنجاب و بنگال میں اکثریت کے متعلق ہماری قوم کے مطالبات کی نسبت بھی قطعی اعلان کرنا پڑتا۔ لہٰذا موجودہ صورت حالات کا اندازہ کرتے ہوئے یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ خود ہمارے رہنماؤں کا رویہ ہی بڑی حد تک (اسلامی مطالبات کے متعلق) وزیر اعظم کے سکوت کا ذمہ دار ہے۔ جس کی وجہ سے مسلم قوم کے دل میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے۔ کہ آخری گول میز کانفرنس کے اختتام پر وزیر اعظم کے یاس انگیز اعلان کے بعد بھی کسی نئی پالیسی کی ضرورت ہے۔ تو اس کی وضع و ترتیب کے امکانات کا جائزہ لیں۔ فرقہ وار سمجھوتے کے متعلق حکومت کی روش سے مسلمانوں کے دل پر طبعاً خطرات طاری ہو گئے ہیں۔ ان کو خیال ہے۔ کہ حکومت ہر قیمت پر کانگرس کا تعاون خریدنے کی کوشش کرے گی۔ اور مسلمانوں کے مطالبات کی تکمیل میں تاخیر اسی لئے کی جا رہی ہے۔ کہ کانگرس کے ساتھ گفت و شنید کی کوئی نہ کوئی بنیاد یا اساس مل جائے۔ سیاسی معاملات کے متعلق حکومت پر بھروسے اور اعتماد کی پالیسی روز بروز قوم میں نامقبول ہو رہی ہے۔ فرنچائز کمیٹی نے حلقہ ہائے انتخاب کی ترتیب اور ان کے

متعلقہ مسائل پر غور و خوض ملتوی کر دیا ہے۔ موجودہ عارضی فیصلے (جس کا اعلان حکومت کی طرف سے ہوگا) کے متعلق یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے۔ کہ فیصلہ خواہ عارضی ہو یا مستقل لیکن وہ مسلمانوں کے لئے اس وقت تک باعث اطمینان نہ ہوگا۔ جب تک مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت کے حقوق دینے کا بندوبست نہ کیا جائے گا۔ جداگانہ انتخاب زباتی رکھنے اور صوبہ سرحد کو برابر کا درجہ دینے کا یقین دلایا جا چکا ہے لیکن کامل صوبجاتی خود اختیاری حکومت پارلیمنٹ سے اختیارات کا براہ راست صوبوں کے ہاتھ میں انتقال۔ فیڈریشن کے تمام اجزائے ترکیبی کی کامل مساوات۔ شعبہ جات کی تقسیم۔ فیڈرل سنٹرل اور پراونشل کے بجائے صرف فیڈرل اور پراونشل۔ پنجاب و بنگال میں اکثریت کے حقوق۔ سندھ کی غیر مشروط علیحدگی اور مرکز میں ایک تہائی نیابت بھی ہمارے قومی مطالبہ کے کم اہم اور کم ضروری اجزا نہیں ہیں۔ ان معاملات کے متعلق وزیر اعظم کی خاموشی کا نتیجہ کانگرس کے ساتھ جنگ اور باقی ملک کے ساتھ فقدان صلح کی غیر دانشمندانہ پالیسی کے سوا کیا نکلا ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو کیا موجودہ مہم میں ہم کانگرس کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ میرا جواب ایک لمحہ کے تامل کے بغیر نفی میں ہے۔ اس تحریک کے مخفی محرکات کے پر غور مطالعہ سے بالکل واضح ہو جائے گا۔ کہ میرا جواب صحیح ہے۔

میں سمجھتا ہوں۔ کہ کانگرس کی موجودہ تحریک خوف اور غصے پر مبنی ہے۔ کانگرس کے رہناؤں کا دعویٰ ہے۔ کہ تنہا وہی باشندگان ہند کے نمائندے ہیں۔ گذشتہ گول میز کانفرنس میں ظاہر ہو گیا۔ کہ ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ اس پر وہ طبعاً خفا اور رنجیدہ ہیں۔ انہیں معلوم ہے۔ کہ اب اہل برطانیہ اور باقی دنیا ہندوستان میں فرقہ وار مسائل کے فیصلے کی اہمیت سے پورے طور پر آگاہ ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے۔ کہ اقلیتیں ایک میثاق بنا چکی ہیں۔ اور حکومت برطانیہ اعلان کر چکی ہے۔ کہ اگر اہل ہند آپس میں سمجھوتہ نہ کر سکے تو حکومت برطانیہ اپنی طرف سے ایک عارضی فیصلے کو نافذ کر دے گی۔ کانگرسی رہناؤں کو اس بات کا اندیشہ ہے۔ کہ حکومت برطانیہ کہیں عارضی فیصلے میں اقلیتوں کے مطالبات مان نہ لے۔ لہذا انہوں نے موجودہ مہم شروع کر دی ہے۔ کہ ایک بے بنیاد دعویٰ کیلئے سامان تقویت بہم پہنچائیں۔ اس میثاق کو ناکام رکھیں۔ جس کے شامل دستور ہو جانے کا انہیں اندیشہ ہے۔ اور حکومت کو مجبور کریں۔ کہ وہ اقلیتوں کا مسئلہ صرف کانگرس کے ساتھ طے کرے۔ کانگرس کی جس قرارداد کے رو سے سول نافرمانی کی مہم شروع ہوئی ہے۔ اس میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا۔ کہ حکومت نے چونکہ مہاتما گاندھی کو ملک کا واحد نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اس لئے کانگرس نے سول نافرمانی کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر وہ اقلیت کس طرح ایک ایسی مہم میں شریک ہو سکتی ہے۔ جو محض حکومت ہی کے خلاف نہیں۔ بلکہ خود اس اقلیت کے بھی ویسی ہی خلاف ہے۔

لہذا یہ حالات موجودہ کانگرس کی مہم میں شریک ہونا خارج از بحث ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس وقت آپ کو نہایت اہم فیصلے کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ آپ قوم کے دل کی موجودہ کیفیت سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ مسلمانوں کے مطالبات کی تکمیل میں حکومت کی تاخیر اور صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات کے عین نفاذ کے وقت بہادر برادران سرحد کے ساتھ بدسلوکی کے باعث ہندوستانی مسلمان برطانیہ کے اوضاع و اطوار سے بدظن ہو رہے ہیں۔ اور اکثر اشخاص سوال کر رہے ہیں۔ کہ آیا ہندوستان میں تیسری جماعت کی موجودگی واقعی مسلم اقلیت کیلئے اس اکثریت کے خلاف ایک حقیقی تحفظ کا ذریعہ ہے جو سیاسی اعتبار سے عاقبت کوشی واقع ہوئی

ہے۔ اور اقتصادی لحاظ سے ہمہ گیر جلب منفعت پر کاربند ہے، اس کی ایک عمیق تر وجہ بھی ہے۔ حالات و واقعات کی تیز رفتار اور سیاسی دنیا کے ناگہانی تغیرات ایک امپیریل جمہوریت کو زیادہ دیر تک کسی قطعی اور معین پالیسی کا پابند نہیں رکھ سکتے۔ علی الخصوص اس حالت میں کہ حکومت کا نظام جماعتی اکثریت و اقلیت پر قائم ہو۔ موجودہ زمانے کے سیاستدانوں میں تخیل کا فقدان عیب کے بجائے خوبی ہے۔ فقدان تخیل اعلیٰ سیاسی تصور میں دوام و تغیر کا ربط و ضبط معلوم کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ موجودہ زمانے کے سیاستدان وسیع تصورات کی دولت سے تہی دست ہوتے ہیں۔ علاوہ مفلس انسانوں کی طرح روزانہ کمائی پر گزران کرتے ہیں۔ ہندوستان جیسے محکوم ملک میں تعاون کرنے والی جماعتیں طبعاً اس خیال پر مجبور ہیں۔ کہ حکومت پر مصیبت کے وقت ان قوموں کا اپنے سیاسی رویہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا۔ ان پارٹیوں کی نظروں میں کم قیمت یا بے وقعت ہوگا۔ جو انگلستان میں وقتاً فوقتاً برسراقتدار آتی رہیں گی انگلستان کی سیاسی پارٹیوں کے مقاصد اور نوعیت خواہ کچھ ہو۔ آپ کو چاہیئے۔ کہ اپنی پالیسی کی بنیاد بالغ نظرانہ ملی مفاد پر رکھیں۔ اور اس پالیسی کو ایسا بنائیں۔ کہ ساری برطانی قوم پر اس کا گہرا اثر پڑے۔ اس جنگ میں شریک ہونا حماقت ہے۔ جس میں فتح و نصرت کے ثمرات ان لوگوں کے ہاتھ میں چلے جانے کا قوی اندیشہ ہو۔ جو یا تو کھلے دشمن ہیں۔ یا ہمارے جائز سیاسی مقاصد کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ موجودہ صورت حالات میں اپنی قوم کو پیش آمدہ مشکلات سے رہا کرنے کے لیئے جدید راہ عمل تجویز کرتے وقت آپ کا فرض ہے۔ کہ جس اندیشہ کا میں نے اظہار کیا ہے۔ اس کا سدباب کریں۔ تاکہ آپ کی قوت عمل کے ثمرات سے آپ کی قوم پورے طور پر متمتع ہو۔ اب میں اس مسئلہ کی حیثیت کو بالکل واضح کئے دیتا ہوں۔ انگریزوں نے ذمہ لیا تھا۔ کہ اگر دوسری گول میز کانفرنس کے بعد مختلف قوموں کے نمائندے ہندوستان واپس جاکر فرقہ وار مسئلہ کا کوئی باہمی تصفیہ نہ کرسکے۔ تو وہ اس کا ایک عارضی فیصلہ کردیں گے۔ چونکہ انگریز ہندوستان کی متخالف قوموں کے درمیان توازن قائم رکھنے کے لیئے ایک ثالث کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس حیثیت سے ان کا وعدہ بالکل مناسب تھا۔ لیکن حکومت برطانیہ کا موجودہ رویہ ظاہر ہے۔ کہ وہ ہندوستان میں غیر جانب دار ثالث کی حیثیت سے رہنے کی نیت نہیں رکھتی اور بالواسطہ گویا ہندوستانی اقوام یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قسم کی خانہ جنگی کی طرف لیجارہی ہے۔ ہم نے اکثریت رکھنے والی قوم کو خوب آزمایا ہے لیکن وہ ان تحفظات کے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ جنکو ہم ایک ایسی قوم کی حیثیت سے جو اپنی زندگی خود مختارانہ بسر کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ ترک نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ان کے ترک میں ہمارا کامل استیصال مضمر ہے۔ دوسرا طریق ہمارے لیئے یہی تھا۔ کہ ہم انگریزوں سے انصاف کی امید رکھتے کیونکہ انہوں نے جب سے اس ملک کو مسلمانوں سے لیا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے دعویدار رہے ہیں۔ کہ ان کی حیثیت ہندوستان میں توازن قائم رکھنے کیلئے ایک غیر جانبدار ثالث کی ہے۔ لیکن ان دنوں ہم نے یہ دیکھا۔ کہ قدیم برطانوی جرأت و دیانت کی جگہ ایک متزلزل اور غیر مستقل حکمت عملی نے لی ہے۔ جس پر کوئی اعتماد نہیں کرسکتا۔ اور جو محض اس غرض سے انگریزوں نے اختیار کر رکھی ہے۔ کہ ہندوستان میں اپنی پوزیشن کو سہولت کے ساتھ قائم رکھ سکیں۔ اب مسلمان اس مسئلہ پر غور کرنے کیلئے مجبور ہوگئے ہیں۔ کہ ان کی موجودہ حکمت عملی جس سے اب تک انگریزوں کی مشکلات تو دور ہوگئیں۔ لیکن مسلمان قوم کے لیئے کوئی مفید نتیجہ مترتب نہ ہوسکا۔ آخر کب تک بدستور جاری رہے گی۔ یہ ایک مسئلہ ہے جس کا تصفیہ مسلم کانفرنس کے اجلاس عام کے ذمے ہے۔ میں موجودہ مرحلہ پر صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔

کہ اگر تم موجودہ حکمت عملی کو ترک کر دینے کا فیصلہ کرو۔ تو تمہارا فوری فرض یہ ہوگا۔ کہ ساری قوم کو ایسے ایثار کے لیے تیار کرو۔ جس کے بغیر کوئی خوددار قوم عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں نہایت نازک وقت آن پہنچا ہے۔ اب دو ہی راستے ہیں، اپنا فرض ادا کرو، یا مر جاؤ۔

حضرات۔ اب میں آپ حضرات کی توجہ کو ان دو مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے مسلمانان ہند کو سخت تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ میری مراد صوبہ سرحد اور کشمیر سے ہے۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ آپ بھی ان مسائل کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔

صوبہ سرحد

بلاشبہ یہ امر موجب مسرت ہے۔ کہ حکومت نے کم از کم صوبہ سرحد کی سیاسی حیثیت کے متعلق ہمارا مطالبہ پورا کر دیا ہے۔ گو ابھی ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ یہ سیاسی حیثیت اس صوبے کے حقیقی نظم و نسق میں کیا صورت اختیار کرتی ہے۔ جرائد کی اطلاعات مظہر ہیں۔ کہ رائے دہی کے معاملے میں حکومت نے جو قواعد نافذ کئے ہیں۔ وہ دوسرے صوبوں کی نسبت زیادہ وسیع اور فیاضانہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جدید اصلاحات آئندہ مہینے سے پوری طرح نافذ العمل ہو جائیں گی۔ لیکن جس چیز نے اس اقدام ترقی کی شان کو خاک میں ملا رکھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اعلان اصلاحات کے ساتھ ہی جبر و تشدد کی ایک ایسی مہم شروع کر دی گئی ہے۔ جو مارشل لاء سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ آئینی پہلو سے جس مراعات کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس کو انتظامی پہلو میں سخت گیری اور غیر مآل اندیشی سے بالکل ضائع کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ حکومت کے پاس صوبہ سرحد کے بعض اشخاص کی انتہا پسندانہ سرگرمیوں کو روکنے کے لئے وجوہ و دلائل بھی ہوں۔ لیکن ہر گیر تشدد کی حکمت عملی کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی ایسی ہی جدوجہد جاری رہی ہے۔ لیکن حکومت نے اس کو روکنے میں خاصی حد تک ضبط سے کام لیا ہے۔ صرف صوبہ سرحد ہی میں تشدد نے ایسی صورتیں اختیار کی ہیں۔ جو کسی مہذب حکومت کے شایان شان نہیں ہیں۔ اگر زبانی اطلاعات صحیح ہیں۔ تو صوبہ سرحد میں انگریزی افسروں کے دلوں کی اصلاح قلمرو برطانیہ کے مفاد کے لئے ان آئینی اصلاحات سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ جو اس صوبے میں نافذ کی جا رہی ہیں۔ گرفتاریوں اور سزایابیوں کی تعداد کے متعلق کوئی حتمی قطعی معلومات اب تک حاصل نہیں ہوئیں۔ لیکن اخباروں کے سرسری بیانات سے واضح ہوتا ہے۔ کہ ہزاروں انسان گرفتار، ماخوذ اور نظر بند کیے جا چکے ہیں۔ حکومت کو سوچنا چاہیئے۔ کہ آیا ثبات اور تشدد کی دو متضاد پالیسیاں افغانوں جیسی خوددار قوم کو مرعوب اور خاموش کر سکیں گی؟ عبدالغفار خان کو نوجوان سرحدی افغانوں پر یقیناً بہت بڑا اثر و اقتدار حاصل ہے۔ لیکن جس چیز نے اس کے دائرہ اقتدار کو اس علاقے کی آخری سرحد ہاں تک اور صوبہ سرحد کے ناخواندہ دیہاتیوں تک وسیع کر دیا ہے۔ وہ غیر دانشمندانہ تشدد کی حکمت عملی ہے جو حکومت نے آجکل اختیار کر رکھی ہے۔ حکومت اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتی کہ اس نازک موقع پر مسلمانان ہند کی آل انڈیا حکمت عملی نے صوبہ سرحد کے مسلمانوں کے اس رجحان کو موثر طریق پر روک رکھا ہے۔ کہ وہ کانگرس کے ساتھ غیر مشروط اتحاد کے علمبرداروں سے جا ملیں۔ ممکن ہے حکومت کے نقطہ نگاہ سے بعض مشکلات بھی موجود ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ اگر انتظامی معاملات میں ذرا مختلف طرز عمل اختیار کیا جاتا۔ تو صورت حالات یقیناً اصلاح پذیر ہو جاتی معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ سرحد کی سیاسی صورت حالات کو

ایسی حالت میں حد سے بدتر بنا دیا گیا۔ جب کہ نرمی اور ملائمت کی حکمت عملی رائج پا چکی تھی، اور تشددانہ طرز عمل ایک ایسے وقت میں اختیار کیا گیا۔ جبکہ مرض کا حقیقی علاج تجویز ہو چکا تھا۔ حکومت جس قدر جلد صوبہ سرحد پر سے تشددانہ قوانین اٹھالے اسی قدر اس صوبہ کے لئے اور حکومت کے لئے مفید ہوگا۔ موجودہ صورت حال نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو بے حد اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے اور اگر حکومت نے اس معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات کو فرو کرنے کی کوشش نہ کی تو یہ امر دانشمندی سے بالکل بعید ہوگا۔

کشمیر

رہا کشمیر کا معاملہ۔ تو یہ ضروری نہیں۔ کہ میں ان تاریخی حقایق کو بیان کروں۔ جن پر اس علاقے کے تازہ واقعات مبنی تھے جس قوم میں خودی اور خودداری کا شعلہ تقریباً بجھ چکا تھا، اس کا بظاہر دفعتہً زندہ و بیدار ہو جانا (ان مصائب و آلام کے باوجود جو اس قوم کو غیر ضروری طور پر برداشت کرنے پڑے) ان لوگوں کے لئے موجب مسرت ہونا چاہیئے۔ جو زمانہ حاضر کی ایشیائی اقوام کی اندرونی جدوجہد کے محرم اسرار ہیں۔ باشندگان کشمیر کا مطالبہ قطعی طور سے حق و انصاف پر مبنی ہے۔ اور مجھے اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ ایک ذہین اور ہنرمند قوم میں اپنی شخصیت کی حقیقت کا یہ جدید احساس بالآخر نہ صرف ریاست کے لئے بلکہ بحیثیت مجموعی اہل ہند کے لئے بھی طاقت و قوت کا ذریعہ ثابت ہوگا لیکن سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے۔ کہ ہندوستان کی فرقہ وارانہ کشیدگی اور مسلمانان ہند کی اپنے کشمیری بھائیوں سے طبعی و قدرتی ہمدردی کے باعث ہندووں میں ایک قسم کی انتقامی شورش پیدا ہو گئی ہے۔ اور ایک وحشیانہ نظام حکومت کو محفوظ رکھنے کے جنون میں اس طرز حکومت کے لازمی نتائج کو پان اسلامک منصوبوں اور کشمیر پر انگریزی اقتدار کے مسلط کرنے کی سازشوں سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کی شورش نے مسئلہ کشمیر کو جو فرقہ وار رنگ دے دیا گیا ہے اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ کہ نہایت وحشیانہ تشدد شروع کر دیا گیا۔ جس سے کشمیر میں مدت مدید تک بے قانون حکومت کا سلسلہ جاری رہا۔ اخبارات کے بیان کے مطابق صوبہ جموں کے بعض حصوں میں نظم حکومت کا ملاً تباہ ہو چکا ہے۔ اور آجکل صرف انگریزی فوج کا وجود (کم از کم ان مقامات میں جہاں یہ فوج موجود رہی ہے) امن و انتظام کے قیام کا ضامن ہے بعض مقامات پر حکام ریاست نہایت مہیب اور شرمناک تشدد کے مرتکب ہوئے ہیں۔ جن کی زبانی اطلاعات اب تک موصول ہو رہی ہیں۔ ایسے حالات میں تحقیقاتی کمیشن بھی بالکل بے نتیجہ ثابت ہو رہے ہیں۔ مڈلٹن کی رپورٹ اہم حقایق کو تسلیم کرنے کے باوجود صحیح نتائج کے استخراج میں ناکام رہی ہے اور اس سے مسلمانوں کا قطعاً اطمینان نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اس حد سے بہت آگے گزر چکا ہے۔ جہاں تحقیقاتی کمیشنوں سے موثر نتائج مرتب ہو سکتے ہوں۔ آج دنیا بھر کے لوگوں میں احساس نفس روز بروز ترقی پذیر ہے۔ جو اپنا اعتراف اس صورت میں کرانا چاہتا ہے کہ جو طاقت لوگوں پر حکومت کر رہی ہے۔ اس میں انہیں روز افزوں حصہ دیا جائے۔ سیاسی غلامی وحشی اور جنگلی لوگوں کے لئے تو مناسب ہے لیکن جب عوام کے زاویہ نگاہ میں تغیر پیدا ہو جائے تو نظم بہترین مقاصد کا تقاضا یہ ہے۔ کہ معقول اصلاحات رائج کرنے سے ہرگز پہلوتہی نہ کیا جائے۔ بعض دوسرے مطالبات بد قسمتی غالباً کشمیر کے مخصوص حالات کا نتیجہ ہیں۔ اہل کشمیر کسی قسم کی نمائندہ اسمبلی کا قیام بھی چاہتے ہیں ہمیں امید رکھنی چاہیئے۔

کہ والیٔ ریاست اور حکومت ہند حتی الامکان عوام کے مطالبات پر ہمدردانہ غور کریں گے۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ نئے وزیر اعظم صاحب اس انتظامی دانشمندی سے کام لے کر جو انگریزوں کی مخصوص قابلیت ہے۔ معاملے کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔ اور ایک نفیس لیکن با اہتمام کی سرگرمیٔ عمل کو اظہار کا موقع دیں گے۔ جس نے قدیم ہندوستان کو اپنے بعض بہترین دماغوں سے مالا مال کرنے کے علاوہ مغلوں کی کلچر میں بھی نہایت دلفریب اضافہ کیا تھا۔ ممکن ہے۔ کہ کشمیر کی آئینی اصلاحات کے رستے میں بعض رکاوٹیں ہوں جس طرح ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ لیکن مستقل امن وامان کے قیام کی مصلحت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ ان رکاوٹوں پر جلد سے جلد قابو پالیا جائے۔ اگر موجودہ تحریک کے حقیقی معانی صحیح طور سے نہ سمجھے گئے اور اس کے وجوہ ان اطراف میں "تلاش کئے گئے" جن میں وہ نہیں مل سکتے تو مجھے اندیشہ ہے کہ حکومت کشمیر کا مسئلہ بہت زیادہ پیچیدہ ہو جائے گا۔

مستقل لائحہ عمل

یہ ظاہر ہے کہ ہمارے مطالبات کے متعلق حکومت برطانیہ نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے! در صوبہ سرحد اور کشمیر میں جو نازک صورت حالات پیدا ہو چکی ہے۔ وہ ہماری پوری توجہ کی محتاج ہے لیکن ہمیں صرف اپنی معاملات پر اپنی فوری توجہ کو محدود نہ رکھنا چاہیئے۔ بلکہ اُن طاقتوں کا صحیح اور واضح تصور ہمارے پیش نظر ہونا چاہیئے۔ جو نہایت خاموشی سے مستقبل کو اپنے سانچے میں ڈھال رہی ہیں۔ اور ہمیں ملک کے آئندہ حالات کی رفتار کے پیش نظر اپنی قوم کے لئے ایک مستقل لائحہ عمل تیار کرنا چاہیئے۔ بعض اوقات ہندوستان کی موجودہ جدوجہد کی یہ تعبیر کی جاتی ہے کہ ہندوستان مغرب کے خلاف بغاوت کر رہا ہے۔ میں اسے مغرب کے خلاف بغاوت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اہل ہند انہی اداروں کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ جن کا مغرب خود حامی ہے۔ یہ ایک بالکل علیحدہ سوال ہے۔ کہ انتخابات کی تماز بازی۔ پارٹی لیڈروں کا خدم وحشم اور پارلیمنٹوں کے خالی خولی نظر فریب تماشے ان کسانوں کے ملک کے لئے موزوں ہوں گے یا نہیں۔ جو جمہوریت جدیدہ کی مالیات و اقتصادیات کے سمجھنے سے یکسر قاصر ہیں تعلیم یافتہ شہری ہندوستانی جمہوریت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اقلیتیں محسوس کر رہی ہیں۔ کہ وہ اپنی اپنی کلچر کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ مستقل حیثیت رکھتی ہیں ان کو اندیشہ ہے کہ ان کی ہستی معرض خطر میں ہے۔ لہذا انہیں تحفظات چاہئیں۔ لیکن اکثریت بعض ایسے وجوہ سے جو سب کو معلوم ہیں تحفظات مہیا کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اکثریت ایک ایسی قومیت کی علمبردار ہونے کا جھوٹا دعوے کر رہی ہے۔ جو مغربی انداز فکر کے اعتبار سے لفظاً درست ہے۔ لیکن ہندوستان کی طرف دیکھئے۔ تو واقعات وحقائق کے اعتبار سے بالکل باطل ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح ہندوستان کی موجودہ جدوجہد میں طرفین انگلستان و ہندوستان نہیں ہیں۔ بلکہ یہ پیکار اکثریت رکھنے والی قوم اور اقلیتوں کے درمیان ہے۔ اور اقلیتیں مغربی جمہوریت کے اصول کو اس وقت تک تسلیم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتیں۔ جب تک ان اصول میں ہندوستان کے حقیقی حالات زندگی کے مطابق مناسب ترمیم و اصلاح نہ کر دی جائے۔

مہاتما گاندھی کے سیاسی طور طریقوں سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ یہ تحریک نفسیاتی معنوں میں "بغاوت" ہے۔ یہ طور طریقے آفاقی شعور کے دو متخالف نمونوں (یعنی مشرقی اور مغربی) کی یکجائی سے پیدا ہوئے ہیں۔ مغربی انسان کی ذہنی ترکیب اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک تاریخی تسلسل رکھتی ہے۔ اس کی زندگی، اس کی حرکت اور اس کا وجود وقت سے وابستہ ہے۔ مشرقی انسان کا آفاقی

غیر تاریخی ہے۔ مغربی انسان کے نزدیک اشیا تدریج وارتقا کے ماتحت ہیں۔ اور اپنا ماضی حال اور مستقبل رکھتی ہیں۔ لیکن مشرقی انسان کے نزدیک ان اشیا کا وقوع فوری ہے۔ وہ قید زمان سے آزاد ہیں۔ اور ان کا وجود محض حال سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسلام جو حرکت زمانی کو حقیقت کا ایک مظہر سمجھتا ہے۔ ایشیا کی ساکن آفاقی تصویر میں ایک غیر اور اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ انگریز چونکہ مغربی ہیں۔ اس لئے وہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کا تصور صرف اسی طریق سے کرسکتے ہیں۔ کہ وہ اصلاحات تدریج وارتقا کے نظام کے مطابق تکمیل پائیں۔ اور مہاتما گاندھی چونکہ مشرق کا ایک انسان ہے۔ اس لئے اسے انگریزوں کے اس رویہ پر شبہ ہوتا ہے۔ کہ وہ غلبہ وطاقت سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ فوری حصول مقصد کے لئے ہر قسم کے سلبی اور تخریبی ذرائع اختیار کرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی فطرت وطبیعت کے سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بغاوت رونما ہو رہی ہے۔

یہ مناظر محض ایک آنے والے طوفان کے آثار ہیں۔ جو سارے ہندوستان اور ایشیا کے باقی حصوں پر بھی چھا جائیگا۔ یہ اس خالص سیاسی تمدن کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس نے انسان کو ایک ایسی "چیز" تصور کر رکھا ہے۔ جس سے جلب منافع کیا جائے۔ حالانکہ انسان ایک "شخصیت" ہے جس کو خالص پھلول طاقتوں سے نشوونما اور ترقی دینی چاہیئے۔ اقوام ایشیا یقیناً اس جابرانہ اقتصاد کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی۔ جس کو مغرب نے ترقی دے کر ایشیا کی قوموں پر عاید کر رکھا ہے۔ ایشیا اپنی غیر منضبط انفرادیت کے ساتھ زمانہ حال کی مغربی سرمایہ داری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر وقیمت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندے کی خدمت میں صرف کردے۔ اس دین قیم کے ممکنات ابھی تمام ختم نہیں ہوئے۔ یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے۔ جس میں انسان کا شرف اس کی قوم اس کے رنگ اور اس کے منافع سے نہیں بلکہ اس کے اعمال اور اس کے طرز زندگی سے معین کیا جائے۔ جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں۔ جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو۔ جس میں ایک اچھوت ایک شہزادی سے شادی کر سکے۔ جس میں ذاتی ملکیت محض ایک وقف ہو۔ اور جس میں سرمائے کو اس طرح المضاعف ہونے کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ اصلی دولت آفرین طبقہ پر غلبہ پا جائے۔ تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے۔ اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم خیالات وجذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں۔ جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے۔ اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے۔ کہ ہم اپنے نوجوانوں کو ان اقتصادی سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے۔ جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت ہے۔ کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر بدل دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوں۔ نئی تمناؤں۔ اور نئے نصب العینوں کی امنگ کو محسوس کرنے لگے۔ ہندوستانی مسلمان اپنی اندرونی زندگی کی گہرائیوں کے تجسس کو مدت سے ترک کر چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی زندگی میں رنگ وآہنگ اور رونق ودرخشانی کا نشان تک نہیں رہا۔ اور ہر وقت اس امر کا خطرہ ہے۔ کہ کہیں وہ محض طاقتوں سے جن کے متعلق اسے بتایا جاتا ہے۔ کہ وہ انہیں کھلی جنگ میں شکست نہیں دے سکتا۔ بزدلانہ ونامردانہ سمجھوتا نہ کرلے۔ جو شخص نامساعد حالات کو بدل دینے کی خواہش رکھتا ہے اسکے لئے ضروری ہے کہ اپنی اندرونی ہستی میں

کامل تغیر و تبدل پیدا کرے۔ خدا قوموں کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قومیں ایک قطعی اور معین نصب العین کی روشنی میں اپنی اندرونی
فعالیت کے دائرہ کو متواتر روشن اور منور کر کے اپنی حالت کو خود نہ بدلیں۔ جب تک کوئی شخص اپنی اندرونی زندگی کے استقلال پر پورا ایمان
نہیں رکھتا، وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی ایمان ہے۔ جو قوم کی نظر کو اس کی منزل پر جمائے رکھتا ہے، اور اسے نہیں عالمی تزلزل سے
بچاتا ہے۔ گذشتہ تجربے سے جو سبق تمہیں حاصل ہوا ہے۔ اس کو خوب یاد کرو کسی طرف سے کوئی توقع نہ رکھو۔ اگر تم
چاہتے ہو کہ تمہارے مقاصد حاصل ہوں۔ تو اپنی پوری "خودی" کو صرف اپنے آپ پر مرکز کر لو اور حقیقی مردانگی سے اپنے آپ کو پختہ فولاد بنا لو۔
مسولینی کا اصول یہ تھا۔ کہ "جس شخص کے پاس فولاد ہے۔ اسی کے پاس روٹی ہے"۔ لیکن میں اس میں ترمیم کر کے کہتا ہوں
کہ "جو شخص فولاد ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے"۔ سخت بن جاؤ۔ اور سخت محنت کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہی ایک
راز ہے۔ ہمارا نصب العین بالکل معین اور واضح ہے۔ وہ نصب العین یہ ہے۔ کہ آئندہ دستور میں اسلام کے لئے ایسا مقام
اور ایسی حیثیت حاصل کریں۔ کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشا کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے۔ اس نصب العین کی روشنی میں یہ ضروری
ہے۔ کہ قوم کی ترقی پسند طاقتوں کو بیدار کیا جائے۔ اور اس کی ان قوتوں کو منظم کیا جائے۔ جو اب تک خوابیدہ ہیں۔ شعلہ حیات دوسروں
سے مستعار نہیں لیا جا سکتا، وہ اپنی ہی روح کے آتشکدہ میں روشن کیا جا سکتا ہے۔ اس ضرورت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ سرگرمی سے
تیاریاں کی جائیں۔ اور ایک اضافی طور پر مستقل پروگرام وضع کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ ہمارا آئندہ پروگرام کیا ہو۔ میرا خیال
کہ اس پروگرام کا ایک حصہ سیاسی اور دوسرا کلچرل ہونا ضروری ہے۔

تجاویز

میں آپ حضرات کے غور و خوض کے لئے چند تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں ا۔

اول۔ ہمیں دیانتداری کے ساتھ یہ تسلیم کر لینا چاہئے۔ کہ جن حضرات سے موجودہ سیاسی جدوجہد میں مسلمانان ہند کی
سرگرمیوں میں رہنمائی کی توقع کی جاتی ہے۔ وہ سیاسی خیالات کے اعتبار سے اب تک بالکل خالی الذہن ہیں نظاہر ہے۔ کہ
اس صورت حالات کی ذمہ داری ملت پر ہرگز عائد نہیں ہوتی۔ عامتہ المسلمین میں ایثار و قربانی کی اسپرٹ بلاشبہ موجود ہے۔
خصوصاً جب اس ملک میں ان کی آئندہ حیات و ممات کا مسئلہ درپیش ہو۔ زمانہ حال کی تاریخ میرے اس دعوے کی شاہد عادل
ہے۔ یہ قصور ہمارا ہے۔ مسلمانوں کا نہیں۔ ان کی رہنمائی جس طریق سے کی جاتی ہے۔ وہ طریق ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا جسے خالص
مسلمانوں کے تخیل کی پیداوار سمجھا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بعض اوقات نہایت نازک موقعوں پر ہماری سیاسی
جماعتوں میں افتراق و انشقاق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان جماعتوں میں وہ نظم و ضبط پوری طرح نشوونما نہیں پاتا جو
سیاسی جماعتوں کی زندگی اور قوت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اس عیب کو دور کرنے کا طریقہ میرے نزدیک یہی ہے۔ کہ مسلمانان
ہند کی صرف ایک سیاسی انجمن ہو۔ جس کی صوبجاتی اور اضلاعی شاخیں سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہوں۔ اس کا نام جو آپ کا جی چاہے رکھ
لیجئے۔ ضروری امر صرف ایک ہے۔ اس کا نظام ترکیبی ایسا ہونا چاہئے۔ کہ ہر سیاسی خیال و عقیدہ کی جماعت کے لئے اس میں اکثریت
حاصل کر کے قوم کو اپنے خیالات اور اپنے طریقہ ہائے کار کے مطابق چلانے کا امکان موجود ہو۔ میری رائے میں یہی ایک طریقہ ہے

جس سے افتراق و تشتت کا سد باب ممکن ہے۔ اور اسی طریقے سے ہندوستان میں اسلام کے بہترین مقاصد کے لئے مسلمانوں کی منتشر طاقتوں کو ضبط و اتحاد کے نظام میں لایا جا سکتا ہے۔

دوم۔ میری تجویز یہ ہے۔ کہ یہ مرکزی انجمن فی الفور ایک قومی فنڈ فراہم کرے۔ جس کی مقدار کم از کم پچاس لاکھ روپیہ ہو۔ بلاشبہ اس زمانے میں مالی مشکلات بہت زیادہ ہیں۔ لیکن آپ یقین رکھئے۔ کہ اگر آپ مسلمانوں کے سامنے موجودہ صورت حالات کی تشویش انگیز اہمیت کو پوری طرح ثابت کرنے کی مخلصانہ کوشش کریں گے۔ تو مسلمان آپ کی آواز پر لبیک کہنے میں ہرگز پہلوتہی نہ کریں گے۔

سوم۔ میری تجویز یہ ہے۔ کہ اس مرکزی انجمن کی ہدایت و نگرانی کے ماتحت ملک بھر میں یوتھ لیگیں اور کیل کانٹے سے لیس رضاکاروں کی کوریں تیار کی جائیں۔ جو علی الخصوص خدمت عامہ۔ اصلاح رسوم اور تنظیم تجارت اسلامی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ قصبات و دیہات میں اقتصادی پراپیگنڈا کریں۔ خصوصاً پنجاب میں جہاں مسلمان زمینداروں کا قرضہ اس قدر نازک صورت اختیار کر چکا ہے۔ کہ ہم اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہتے۔ کہ کسانوں میں کوئی انقلابی تحریک پیدا ہو جائے۔ جو اس مصیبت کا آخری علاج ہو۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ پنجاب میں بھی حالات اس درجہ انتہا تک پہنچ چکے ہیں۔ جس پر ۱۹۲۵ء میں چین پہنچ گیا تھا۔ اور وہاں کسانوں کی لیگیں قائم ہو گئی تھیں۔ سائمن رپورٹ میں یہ حقیقت تسلیم کی گئی ہے۔ کہ کسان اپنی آمدنی کا "معقول حصہ" سلطنت کی نذر کر دیتا ہے۔ بلاشبہ سلطنت بھی اس کے عوض میں اس کو امن و امان۔ تجارت اور رسل و رسائل کی سہولتیں مہیا کرتی ہے۔ لیکن ان "برکات" کا نتیجہ صرف یہی نکلا ہے۔ کہ محاصل میں ایک قسم کی سائنٹیفک بے ضابطگی پیدا ہو گئی ہے۔ مشینوں کی بنی ہوئی اشیاء نے دیہاتی اقتصاد کو تباہ کر دیا ہے۔ اور کسان کی فصلیں تجارت کی لپیٹ میں آ گئی ہیں جس نے کسان کو ساہوکاروں اور تجارتی گماشتوں کے منصوبوں کا شکار بنا دیا ہے۔ پنجاب میں خصوصاً یہ معاملہ بے حد نزاکت و اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ مجوزہ یوتھ لیگیں اس معاملے کے متعلق پراپیگنڈا میں خاص مہارت حاصل کریں۔ اور اس طرح کسانوں کو ان کی موجودہ غلامی و نکومی سے نجات دلانے میں ان کی امداد کریں۔ میری رائے میں ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل پنجاب کے مسلمان کسانوں کی آزادی پر منحصر ہے۔ اس لئے لازم ہے۔ کہ جوانی کی آگ یقین کی آگ کے شعلوں میں پیوست ہو کر فروغ حیات کو روشن تر بنا دے۔ اور ہماری آئندہ نسلوں کے لئے خیالات و اعمال کی ایک نئی دنیا پیدا کر دے۔ قوم صرف زمانہ حال اور بے شمار سرداروں کے مجموعے ہی کا نام نہیں۔ جب تک قوم کی اس نا زائیدہ لامحدودیت کو مدنظر نہ رکھا جائے۔ جو اس کی اندرونی ہستی کی گہرائیوں میں خوابیدہ ہے۔ اس وقت تک ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے اس کی حرکت و حیات کے معنی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔

چہارم۔ میری تجویز یہ ہے۔ کہ ہندوستان کے بڑے شہروں میں مردانہ و زنانہ کلچرل ادارے قائم کئے جائیں۔ ان اداروں کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ان کا سب سے بڑا وظیفہ یہ ہونا چاہئے۔ کہ اسلام نے نسل انسانی کی مذہبی اور کلچرل تاریخ میں جو کارنامے زمانہ ماضی میں کئے ہیں۔ اور جو کچھ وہ مستقبل میں کرنے والا ہے۔ اس کا صحیح احساس مسلمان بچوں کے دلوں میں پیدا کر کے ان کی خوابیدہ روحانی طاقتوں کو بیدار اور منظم کیا جائے۔ کسی قوم کی ترقی پسند قوتوں کو بیدار کرنے کا طریقہ

صرف یہی ہے۔ کہ اس کے سامنے ایک نئی راہ عمل پیش کی جائے۔ جس کا مقصد یہ ہو۔ کہ فرد کی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ تاکہ وہ قوم کی زندگی کو علیحدہ علیحدہ مختلف پاروں کے ایک انبار کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ ایک معین و مشخص مجموعہ کی حیثیت سے جو داخلی جمعیت و اتحاد کا سرمایہ دار ہے محسوس کرے۔ اور تجربہ و مشاہدہ سے اس کی ہستی کا قائل ہو۔ جب ایک دفعہ یہ قوتیں بیدار کر دی جائیں۔ تو وہ نئی کشمکشوں کے لئے تازہ امنگ کو برانگیختہ کر دیتی ہیں۔ اس اندرونی آبادی کا احساس دلاتی ہیں۔ جو مزاحمت اور کشمکش سے مسرت اندوز ہوتی ہے۔ اور ایک نئے احساس خودی کی امیدوں کو تازہ کر دیتی ہے۔ ان اداروں کو ہماری قدیم و جدید علمی درسگاہوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھنا ہوگا۔ تاکہ ہماری تعلیمی مساعی کے تمام اطراف بالآخر ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں۔ اس سلسلے میں ایک عملی تجویز میں ابھی پیش کئے دیتا ہوں۔ ہارٹوگ کمیٹی کی رپورٹ میں جو ہمارے سیاسی مسائل کے ہیجان میں بظاہر بالکل نذر فراموشی ہو چکی ہے۔ مندرجہ ذیل سفارشیں کی گئی ہیں۔ جو میرے نزدیک مسلمانان ہند کے لئے بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ اگر صوبجات میں جہاں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں مذہبی مشکلات مزاحم ہوتی ہیں۔ مذہبی تعلیم کا ایسا انتظام کیا جا سکے۔ جس سے یہ قوم اپنے بچوں کو معمولی مدارس میں بھیجنے پر راغب و مائل ہو سکے تو تعلیم کا سرکاری نظام، کفائت شعاری اور عمدگی تعلیم دونوں میں ترقی کرے گا۔ اور قوم کو تعلیمی واماندگی کی ذلت اور اس کے نقصانات سے آزاد کرنے کا کام بہت بڑی حد تک انجام پا جائے گا۔

ہم کو پوری آگاہی ہے۔ کہ اس قسم کے انتظامات آسان نہیں ہیں۔ اور دوسرے ممالک میں ان کی وجہ سے بہت اختلاف آراء پیدا ہوا ہے۔ ...... لیکن ہماری رائے میں اب وقت آگیا ہے۔ کہ عملی تدابیر وضع کرنے میں عزم مصمم سے کوشش کی جائے۔ (صفحات ۲۰۴-۲۰۵)

پھر صفحہ ۲۰۶ پر تحفظات پر بحث کرتے ہوئے رپورٹ مظہر ہے۔ کہ

لہٰذا اگر سرکاری نظام تعلیم کے اندر بحالات موجودہ ایسے خاص انتظام کر دیئے جائیں۔ اور کچھ مدت تک قائم بھی رکھے جائیں۔ جو مسلمانوں کو قومی زندگی اور ترقی کی تحریک میں پورا حصہ لینے کے قابل بنا دیں۔ تو ہماری رائے میں یہ امر صحیح اصول جمہوریت یا صحیح اصول تعلیم کے ہرگز منافی نہ ہوگا۔ کاش ہم یہ کہہ سکتے۔ کہ تحفظات کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن ہماری یہ خواہش یقیناً ہے۔ کہ تحفظات حتی الامکان کم سے کم ہونے چاہئیں۔ چونکہ ان سے تعلیمی نظام میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے بجائے خود ان کا وجود ناپسندیدہ ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ان کے بغیر مسلمان بدستور تعلیم میں واماندہ رہیں گے۔ اور علیحدہ علیحدہ ادارات تعلیمی کے نظام سے جو بڑے بھلے مواقع ان کو حاصل ہیں۔ ان پر قناعت کرنے پر مجبور رہوں گے۔ تو ہمیں بلا تامل تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ قومی حکمت عملی کی وسیع بنا پر تحفظات

مجوزہ کلچرل اداروں کا فرض ہوگا۔ اور جب تک وہ قائم نہ ہو سکیں۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ بارڈولک کمیٹی کی ان سفارشات پر عمل درآمد ہو جائے۔ کیونکہ یہ سفارشات اس مسئلہ کی بناپر کی گئی ہیں۔ کہ ہماری قوم بحالات موجودہ تعلیم میں پس ماندہ ہونے کی وجہ سے چند در چند نقصانات اٹھا رہی ہے۔

پنجم۔ میری تجویز یہ ہے۔ کہ ایک جمعیت علما قائم کی جائے جس میں وہ مسلمان قانون دان لازماً شامل ہوں جنہوں نے جدید قانونی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے۔ کہ شرع اسلامی کی حفاظت کی جائے۔ اس کو وسعت دی جائے۔ اور اگر ضروری ہو۔ تو حالات جدیدہ کی روشنی میں نئے سرے سے اس کی ایسی تعبیر و تاویل کی جائے۔ جس میں اس کے اصول اساسی کی سپرٹ کی خلاف ورزی ہرگز نہ ہونے پائے۔ اس مجلس علما کی حیثیت آئینی اعتبار سے مسلّم ہونی چاہیئے۔ تاکہ ہر مسودہ قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لا (شخصی قانون) سے تعلق رکھتا ہو۔ مجلس وضع قوانین میں زیر بحث آنے سے پیشتر اس جمعیت علماء میں پیش ہو کر بحث و تمحیص کے تمام مراحل طے کرے۔ مسلمانان ہند کے لئے اس تجویز کی جو عملی قدر و قیمت ہے۔ اس سے قطع نظر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ابھی دنیائے جدید کو (جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں) یہ معلوم ہی نہیں۔ کہ اس سرمایہ دار دنیا کے لئے جس کے اخلاقی معیار انسان کی مالی و معاشی سیرت پر مدت سے کوئی اقتدار نہیں رکھتے۔ اسلام کا قانونی لٹریچر کس قدر اہم اور کس قدر بیش بہا ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ جس قسم کی جمعیت کے قیام کی تجویز میں نے کی ہے۔ اس سے کم از کم اس ملک میں اسلام کے اصولِ قانون زیادہ بہتر طریق پر سمجھے جائیں گے۔ اور ان کی صحت کا عام احساس پیدا ہو جائے گا۔